فورٹ ولیم کالج

سجاد احمد سلطان

ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی اغراض کے لئے وارد ہندوستان ہوئی اور موقعہ پا کر حکومت پر قابض ہوگئی۔ حکومت کا نظم و نسق احسن طریقے سے چلانے کے لئے اُنہیں ہندوستانیوں کی تہذیب، کلچر اور خاص کر زبان سمجھنے کے لئے فورٹ ولیم کالج جیسے ادارہ کی ضرورت محسوس ہوئی، جو ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں ہنگامی بنیادوں پر انتظامی امور کو انجام دینے کی غرض سے قائم کیا گیا۔ اس کالج کے قیام سے قبل اُردو میں نثری سرمایہ کا فقدان پایا جاتا تھا اور اگر کہیں نثری نمونے ملتے تھے، اُن کی زبان بہت حد تک مغلق اور فارسی آمیز تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت تک فارسی علمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے زبان زدِ عام تھی اور فارسی آمیز لہجہ کے اعتبار سے مقفیٰ و مسجع ہوا کرتی تھی۔ جس کا فہم و ادراک نو وارد انگریز عہدہ دران کے لئے بہت ادق تھیں۔ اسی طرح سے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھوائی گئیں۔ جس کے لئے ملک کے گوشے گوشے سے ادیبوں اور انشا پردازوں کو جمع کیا گیا۔ اور اُن سے بجائے طبع زاد لکھوانے کے اُس زمانے میں موجودہ فارسی کتابوں، داستانوں کا ترجمہ کرنے کے لیے تاکید کیا گیا کیونکہ کو نصاب کتب کی تیاری میں عجلت درپیش تھی۔ اس لئے ان ادیبوں سے داستانوں کا سیدھا، سادھا، سلیس اور عام فہم زبان میں ترجمہ کرانے پر زور دیا گیا۔ دراصل فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریز عہدہ داروں کو اردو سکھانے کے لئے وجود میں لایا گیا تھا۔ ڈاکٹر سید عبدالطیف نے ''ارباب نثر اُردو'' کے پیش لفظ میں بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے فورٹ ولیم کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ نظمائے کمپنی کا اصل منشا کلکتہ میں چند ارباب قلم کو یکجا جمع کر کے ان سے اپنے انگریز اہل کاروں اور عہدہ داروں کے لیے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا طرز بیان شاعرانہ نذاکتوں اور لفظی موشگامینوں کے بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفوں کو اس بات کا بہت کم موقع دیا گیا کہ وہ قلم کی سحر کاریوں سے اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے۔ کالج کے اربابِ اقتدار کو ضروری نصابی کتب کی تیاری میں عجلت تھی۔ اس لیے ان مصنفوں سے بجائے مشکل کتابیں تصنیف کرانے کے مشہور، متبادل اور بالخوص فارسی کی عام کتابوں کے ترجمے کرائے گئے۔''

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے تھیں جو اُردو زبان سیکھنا چاہتے ہوں۔ اُردو میں مبتدیوں کے پڑھنے کے لیے کتابیں نہیں تھیں۔ اس لئے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس زبان میں، مقفیٰ و مسجع سے پاک وصاف

kashmirstudent2020.blogspot.com

نے انجام دیا۔گلکرسٹ کے کارناموں پر تفصیل ڈالنے سے قبل اس کالج کے بارے میں چند انکشافات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔حالانکہ کالج کا باضابطہ طور پر قیام ضوابطوں کے تحت ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء میں لایا گیا لیکن انہیں ٹیپو سلطان کی شہادت کا ایک سالہ جشن منانا تھا تو انہوں نے ۱۰ کے بدلے میں ۴ رمئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی۔دوسری بات یہ کالج کسی قلعے پر قائم کیا گیا، بلکہ کلکتہ شہر کے مرکز میں ایک سرکاری عمارت میں ۴ فروری ۱۸۰۱ء سے باضابطہ طور پر کام کرتا شروع کیا۔اس کے لئے کبھی بھی کوئی عمارت تعمیر نہیں کی گئی،جس جگہ پر اس نے اپنا کام کرنا شروع کیا تھا اُس جگہ کو آج (writters buildings) کہتے تھے۔آج اس جگہ ایک شاندار بلڈنگ بنی ہے جو مغربی بنگال کے وزیر اعلا کا دفتر ہوتا ہے۔نہ یہ دریائے ہگلی کے کنارے تعمیر کیا گیا بلکہ شہر کلکتہ میں ہی قائم ہوا تھا جہاں کالج کبھی تھا ہی نہیں۔پرنسپل لے لئے پرووسٹ اور وائس پرنسپل کے لیے نائب پرووسٹ، بڑے پوسٹ پادریوں کو ہی دئے جاتے تھے۔دیسی لوگوں کو منشی وغیرہ کا نام دے دیا گیا۔یہاں عیسائیت کی تعلیم لازمی قرار پائی۔عتیق احمد صدیقی کے مطابق کالج کا پہلا پرنسپل پادری ریوزنڈر براؤن تھا۔ان باتوں سے قطع نظر فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مصنفین اور ان کے کارناموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ:Dr.John Barth Wick Gilchrist(1841-1759) اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔علم طب حاصل کر لینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی میں بحیثیت ڈاکٹر تعینات ہوا تھا۔ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے فارسی اور اُردو زبان میں دلچسپی لینی شروع کی اور ایسا یار آور ہونے کے لئے انہوں نے ہندوستانی وضع قطع اپنایا اور اُردو زبان کے مراکز دہلی اور لکھنو میں رہ کر فارسی اور اُردو سیکھی۔انہوں نے کمپنی کو مطلع کیا کہ اب فارسی زبان دفتری زبان بنائے رکھنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اُردو کو دفتری زبان مفید ہوگا۔بعد میں ۱۸۳۲ء میں اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔گلکرسٹ تقریباً ۳۰ سال تک تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔انہوں نے بہت ساری کتابیں لکھیں۔

انگریز ہندوستانی لغت، ہندوستانی علم اللسان،اُردو کی صرف ونحو،مشرقی زبان داں،اُردو زبان پر مختصر مقدمہ،ہندی کی آسان مشقیں،فارسی افعال نظریہ،اجنبیوں کے لئے رہنمائے اُردو، بیاض ہندی،علمی خاکے،ہندی الفاظ کی قرأت،اتالیق ہندی،ہندی عربی آئینہ،مکالمات انگریزو ہندوستانی،مشرقی قصے اور داستان گو۔

میر امّن دہلوی:۔ان کا اصلی نام میر امان تھا۔امن تخلص تھا۔دہلی میں ان کی ولادت ہوئی۔تیس سال تک دہلی میں قیام پزیر رہے۔احمد شاہ درانی کے حملے میں ان کا گھر بار لٹ گیا اور سورمل جاٹ نے ان کی جاگیر پر قبضہ کر لیا۔چنانچہ شکست حال پٹنہ تشریف لے گئے اور چند سال مصیبتوں میں گذار کر اپنے اہل وعیال کو وہیں چھوڑ کر کلکتہ آگئے میر بہادر علی حسینی کے توسط سے جان گلکرسٹ تک رسائی یقینی بن گئی۔جس نے ان کی علمیت سے متاثر ہوکر فورٹ ولیم کالج میں بطور منشی ملازمت دے دی۔

جہاں انہوں نے ''باغ وبہار'' اور ''گنج خوبی'' لکھی۔''باغ وبہار'' حقیقت میں میر محمد حسین عطا خان تحسین کی نوطرز مرصع ہے جس سے گلکرسٹ کی فرمائش پر سادہ اور عام بول حال کی زبان میں میر امن نے ۱۸۰۲ء میں لکھا۔داستانی ادب میں جن

kashmirstudent2020.blogspot.com

خوبیوں اور خامیوں سے عبارت ہے وہ سبھی باغ و بہار میں پائی جاتی ہے۔اس داستان کو لافانی اور شاہکار بتانے والی شے ان کا اسلوب ہے۔میر امن کو دہلی زبان پر عبور تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے روزانہ بول چال میں قصے کو پیش کیا ہے۔اس کا اندازِ بیان بہت سادہ دلکش اور موثر ہے اور یہی اس دستان کی سب سے بڑی خوصیت ہے۔یہ اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے اُردو نثر کی پہلی زندہ کتاب گرداں ہے۔

سید حیدر بخش حیدری: میر امن کے بعد فورٹ ولیم کالج میں انہیں کافی شہرت نصیب ہوئی۔جب فورٹ ولیم کالج میں انہیں ملازمت ملی تو انہوں نے گل کرسٹ کو اپنی کتاب ''قصہ مہر و ماہ'' کو پیش کی۔جو انہیں بے حد پسند آئی۔بعد میں انہوں نے قصہ لیلیٰ مجنون (امیر خسرو کی مثنوی کا نثری ترجمہ (طوطی کہانی جو سنسکرت زبان کی ''شک سپ تتی'' پر مبنی ہے۔جس کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں' ان کی تیسری کتاب ''آرائش محفل''یعنی قصہ حاتم طائی کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔

اسکے علاوہ میر شیر علی افسوس،میر بہادر علی حسینی اور مرزا علی لطف کے علاوہ بھی کئی مشہور و معروف ادبا فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہے اور تصنیف و تالیف اور ترجمے کے کام میں مصروف رہے۔ان میں مولوی امانت اللہ،مظہر علی خان،مرزا جان طپش،میر کاظم علی جوان،شیخ حفیظ الدین،خلیل خان اشک،مولوی اکرم علی،نہال چند لاہوری،منشی بنی نارائن جہاں وغیرہ وغیرہ۔

kashmirstudent2020.blogspot.com

علی گڑھ تحریک

سجاد احمد سلطان

علی گڑھ تحریک مسلمان قوم کے محسن اور اُردو ادب کے مسیحا سرسید احمد خان کی انتھک کوشش اور بے مثال قربانی سے وجود میں آئی۔اس تحریک نے ایک شکستِ خوردہ قوم کو تباہی و بربادی کے دلدل سے نکال کر اس کا کھویا ہوا وقار بہت حد تک بحال کردیا۔سرسید بیک وقت مصلح،مفکر،ماہرِ تعلیم،صحافی اور صاحبِ اسلوب تھے۔

علی گڑھ تحریک کا آغاز ۱۸۵۷ء کے غدر اور اس کے غضبناک حالات سے ہوا۔غدر کے حالات نے سرسید کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔انگریز حاکموں کے ہاتھوں ملک اور قوم کی جو بربادی ہوئی اس سے سرسید کے دل کو بڑی ٹھیس پہنچی۔غدر کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں ایک خلیج پیدا ہوئی۔انگریزوں کے دل میں یہ بات گھر کر گئی اس غدر کی لڑائی میں مسلمانوں کا سب سے بڑا عمل دخل رہا۔اُدھر مسلمان بھی انگریزوں سے نفرت کرنے لگے یہاں تک کہ انہوں نے انگریزوں کی ہر چیز سے بائیکاٹ کیا،حتیٰ کہ ان کی زبان سیکھنے سے بھی نفرت کرنے لگے۔سرسید ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر دل ہی دل میں غور و فکر کر کے تدبیریں ڈھونڈنے لگے۔انہوں نے اپنی قوم کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے یہ جذبہ اُجاگر کیا اور اُن کو اس بات کے لئے راضی کیا کہ مسلمان جدید علوم،صنعت وحرفت،ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کئے بغیر ترقی کی راہوں پر گامزن نہیں ہوسکتے۔اس لئے سرسید نے ایک انجمن سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد انگریزی کی اعلیٰ علمی،تہذیبی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے اور ان لوگوں کو اس سرمایہ سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا جائے۔جو براہ راست انگریزی زبان کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔انہوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جس کی بنیاد لارڈ لٹن کے ہاتھوں ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔یہی سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ مانا جاتا ہے جو آج ہمارے سامنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔۱۸۶۹ء میں سرسد انگلستان گئے۔انہوں اپنی آنکھوں سے وہاں کی یونیورسٹی کو دیکھا جس سے ان کا منزلِ مقصود روشن ہوا۔ذہنوں کو بدلنے کے لئے انہوں نے اپنا رسالہ ’’تہذیب الا اخلاق‘‘ نکالا۔اسلام کی تشریح عقل کی روشنی میں کی اور جدید سائنس کو سامنے رکھکر مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی۔سرسید ’تہذیب الا اخلاق‘ سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو انگلستان میں ایڈیسن اور اسٹیل دو اخبار ’’اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر‘‘ نکال کر انجام دے رہے تھے۔اس ’’تہذیب الا خلاق‘‘ مقالہ نگاروں میں سرسید کے بہت قریبی ساتھی بھی شامل تھیں۔اس رسالے کے اجرا کا مقصد خود سرسید کی زبانی پیش ہے۔

’’ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تا کہ جس حقارت سے

kashmirstudent2020.blogspot.com

تہذیب الاخلاق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شاہ ولی اللہ کے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی کہ اجتہاد ہر دور میں فرض ہے۔اس نے مسلمانوں کو مذہبی وسماجی رجعت پسندی کے غار سے باہر آنے کی دعوت دی۔اس اخبار کے خلاف بہت سے اخبار نکالے گئے۔اس کی مخالفت مسلمان اخبار نے کی جو سرسید کی مخالفت کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے مثال کے طور پر مولوی امداد علی نے تہذیب الاخلاق کے طرز پر ایک رسالہ ''امداد الآفاق'' اس رسالے کی تردید میں مولوی علی بخش خان بہادر نے شہابِ ثاقب اور تائید الاسلام نکالے۔دہلی کے اکمل الاخبار کو بھی سرسید کے مخالف اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سرسید نے اُردو میں جس آسان، سادہ اور علمی نثر کا آغاز کیا وہ بہت کچھ انہی کی مرہونِ منت ہے۔انہوں نے اُردو نثر کو سنوارا اور پختہ رنگ وروپ بخش کر علمی معیار عطا کیا۔سرسید سے مضمون نویسی اور انشائیہ نگاری کا اُردو ادب میں آغاز ہو گیا۔بقول آل احمد سرور: سرسید اُردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔جس نے ہر طرح کے مضامین لکھیں۔سرسید کی نثر کا اس حد تک اثر تھا کہ ان کے مخالفین بھی انہی کی تحریر میں جواب دینے کی کوشش کرتے جس سے سرسید کی نثر کو اور پھلنے پھولنے کے سنہری مواقع میسر ہوئے۔ان کے رفیقوں میں نواب محسن الملک، حالی، آزاد وغیرہ نے ایسے مضامین لکھے جن میں انشائیہ کی نشانیاں موجود ہیں۔سرسید کا ایک بڑا کارنامہ کہ انہوں نے اُردو نثر کو بوجھل پن سے پاک کیا۔رنگین عبارت آرائی کی جگہ سادگی اور اختصار نے لے لی اور نثر نگاری کا رواج عام ہوا۔سرسید تحریک کی بدولت خالص ادبی سطح پر اُردو میں تنقید نگاری، سیرت نگاری، تاریخ نگاری، ناول نگاری، سوانح نگاری وغیرہ کا نہ صرف آغاز ہوا بلکہ ان اصناف نے کئی ابتدائی مراحل اُس دور میں طے کئے۔مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اُردو نثر میں نئی جان ڈالنے والا یہ محسن ۱۸۹۸ء میں ابدی نیند سو گیا۔

kashmirstudent2020.blogspot.com

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو صحافت

سجاد احمد سلطان

صحافت ایک معتبر پیشہ ہے۔ اخبار نویسی، صحیفہ نگاری یا جرنلزم کے دیگر ناموں سے بھی مشہور ہے۔ صحافت نگار، صحافی، اخبار نویس یا جرنلسٹ کہلاتا ہے۔ کچھ صحافی اس مقدس پیشہ کو ایک نیک عمل مان کر عوام کی صحیح ترجمانی کر کے اس سے اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں اور گونا گوں مسائل کی تہہ تک جھانکر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ اس سے اپنے دلی تسکین اور شہرت کے باعث اپنا کر اس کے ساتھ حقیقی معنوں میں حق ادائی نہیں کرتے ہیں انہیں آزاد صحافی یا فری لانس جرنلسٹ کہا جاتا ہے۔

صحافت ایک ذمہ دارانہ اور محنت طلب پیشہ ہے جس میں ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سچ کو منکشف کرنے کی دلیرانا اخلاقی جرأت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے ایک آرام بخش و راحت افزا کام سمجھ لینا نادانی ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا محنت طلب فن ہے جو صحافی سے پوری سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ جنبش قلم دینے کا فن تو ظاہر میں آسان نظر آتا ہے مگر حقیقت میں بے حد ریاضت کا متقاضی ہے۔ ہنسی مزاق یا ہلکی پھلکی تفریح کے خاطر صحافت سے ناطہ جوڑنے کا خیال بیوقوفی کے مترادف ہے۔ یہ فن دوسرے پیشوں کی طرح کتابوں میں نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ اس فن میں مہارت بھی کلاس روم کی چار دیواری میں بیٹھ کر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ فن تجربہ کی بھٹی میں جل کر نکھرنے کا نام ہے یہ ایک مسلسل ہنر ہے جس میں آئے دن نت نئے خیالات، واقعات، حوادثات، تجربات اور افکار سے نباہ کرنا پڑتا ہے اس کی ہر بات میں ایک نیا سبق مضمر ہوتا ہے۔

میتھو آرنالڈ نامی مشہور انگیریزی ادیب نے صحافت کی تعریف یوں کی تھی: ''صحافت عجلت میں لکھا گیا ادب ہے''۔

جدید صحافی اس تعریف سے متفق نہیں ہیں کیونکہ اس میں ایک طرح سے صحافتی پیشہ کی تذلیل ہے دیکھا جائے تو دونوں کا میدان الگ الگ ہے۔ ادب کے لئے وقت کی کوئی خاص قید مقرر نہیں ہوتی جب کہ صحافت کو ہمیشہ وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔

''صحافت جدید وسائل ابلاغ کے ذریعہ، عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے''۔

ریاست جموں وکشمیر میں صحافت کا آغاز ۱۹۲۴ء سے ہوتا ہے جب جموں میں لالہ ملک راج صراف نے پہلا ہفت روزہ اخبار ''رنبیر'' جاری کیا۔ اس سے قبل مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اُردو کتابوں کی طباعت کے لئے ''بدیا بلاس'' نام کا جو چھاپ

kashmirstudent2020.blogspot.com

اخبار مانتے تھے۔ محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں ''ریاست میں اُردو کا پہلا اخبار 'بدیا بلاس' ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔ یہ اخبار ریاست میں صحافت کی شمع روشن کرنے کی پہلی دیا سلائی تھا جس کے مدیر پنڈت گوپی ناتھ گرٹو تھے۔

بدیا بلاس کے ایک سرکاری اخبار کی حیثیت سے شائع ہونے کے باوجود مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ایک ایسے اخبار کمی شدت سے محسوس کی جاری تھی، جو عوامی خواہشات وجذبات کا آئینہ دار ہو۔ چنانچہ کئی اصحابِ فکر ودانش نے متعدد بار مہاراجہ کے دربار میں درخواست دی کہ انہیں ریاست میں اخبار جاری کرنے اور چھاپ خانہ نصب کرنے کی اجازت دی جائے لیکن ہر بار درخواست مسترد ہوئی۔ نتیجتاً یہ لوگ ریاست سے باہر کے شہروں لاہور، جالندھر، سیالکوٹ، امرتسر، لکھنو وغیرہ سے اخبار جاری کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس سلسلے میں پنڈت ہرگوپال خستہ اوران کے بھائی پنڈت سالک رام کول سالک کی کوششوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں ۱۸۸۲ء میں سالک کا خیر خواہِ کشمیر لاہور سے شائع ہوا، ۱۸۸۵ء میں بابو غلام محمد کا ہفتہ روزہ آئینہ ہند لاہور سے اور ۱۹۰۱ء میں منشی محمد دین فوق کا ہفتہ روزہ پنجۂ فولاد لاہور، ۱۹۲۴ء خواجہ غلام محی الدین کا ہفتہ روزہ کشمیر امرتسر سے اور مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کی مشترکہ مساعی سے لاہور سے جاری ہونے والے اخبارات 'مظلوم کشمیری' مکتوبِ کشمیر، کشمیری مسلمان اور ہاتو وغیرہ شامل ہے۔

ریاست سے باہر مختلف شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات وجرائد کسی نہ کسی طرح یہاں تک بھی پہنچتے اور عام لوگوں کے شوقِ خبر بینی کی تسکین کا ذریعہ جاتے تھے۔ اس دور میں بدیا بلاس کے آغاز واشاعت سے لے کر ۱۹۲۴ء میں رنبیر جاری ہونے تک اگر کسی شخص نے اخبار نکالنے کی کوشش کی تو اس سے بقول رشید تاثیر جائیداد کی ضبطی اور جلاوطنی کی عبرتناک سزا کا موجب قرار دیا گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معدودے چند معمولی درجے کے اخبارات کے سوا جن کا تذکرہ غالباً پہلی بار رشید تاثیر نے اپنی کتاب نقوشِ صحافت میں کیا ہے۔ ۶۷ برس کی اس طویل مدت میں کوئی قابلِ ذکر اخبار شائع نہیں ہوا۔ بدیا بلاس کے بعد تحفہ کشمیر کو ریاست کا دوسرا اور وادی کشمیر کا پہلا اخبار قرار دیتے ہوئے تاثیر نے لکھا ہے کہ اس اخبار کو ہفتہ روزہ کی شکل میں منشی کرم رائے نے ۱۸۷۶ء میں سرینگر سے شائع کیا۔ ۱۹۰۵ء میں منشی محمد دین فوق نے مہاراجہ پرتاب سنگھ کو ایک درخواست پیش کی جس میں کشمیر نام سے ایک رسالہ جاری کرنے کی اجازت طلب کی گئی لیکن ڈوگرہ دربار نے بقول فوق نہ صرف اجرائے اخبار کی اجازت دینے سے انکار کیا بلکہ یہ بھی تحریر فرمایا کہ ہم پریس کے معاملہ میں کوئی درخواست سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ۱۹۰۳ء میں لداخ سے پہلا ماہنامہ لداخی نیوز، ۱۹۰۴ء میں لداخ کی زبان کا اخبار لداخی پھویَاں، ۱۹۰۷ء میں جموں سے ماہنامہ ڈوگرہ گزٹ اور ماہنامہ نیتی پتر اور ۱۹۰۸ء میں ماہنامہ ڈوگرہ سماچار جاری ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں مہاراجہ پرتاب سنگھ نے جموں اینڈ کشمیر سٹیٹ پریس اینڈ پبلی کیشنز ریگولیشن ایکٹ مجریہ ۱۹۱۷ء نافذ کیا جس کی وجہ سے کسی نے اخبار نکالنے کی جرأت نہ کی۔ مئی ۱۹۲۴ء میں کافی تگ ودو کوشش کے بعد لالہ ملک راج صراف کو مہاراجہ کی جانب سے ہفتہ روزہ رنبیر شائع کرنے کی اجازت مل گئی اس طرح مئی ۱۹۲۴ء کو رنبیر کا پہلا شمارہ جموں سے منظر عام پر آیا۔ جس سے نہ صرف اُردو صحافت کا باقاعدہ آغاز

kashmirstudent2020.blogspot.com

ہوا بلکہ بڑی حد تک ایک حقیقی عوامی اخبار کی داغ بیل بھی پڑھ گئی۔ رنبیر کے بعد ریاست میں اخباروں کے اجرا کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ اسے بعد صحافت ایک نئے سنہرے ادوار سے گزر کر آج بھی اپنے فرائض منصبی روز ناموں ہفتہ روزوں، ماہناموں، سہ ماہی، شش ماہی کی صورت میں نئے آب وتاب کے ساتھ سر گرم منزل ہے۔ طوالت سے بچتے ہوئے تفاصیل سے گزیزاں کرتے ہوئے ۱۹۹۲ء تک

ریاست میں شائع ہورہے اخبارات وجرائد کی تفصیل پیش خدمت ہے۔ صوبہ کشمیر روز نامے ۲۸، ہفتہ روزے ۲۵، ۱۵ روزے ایک

، ماہنامے تین، دو ماہی ایک، صوبہ جموں، روز مانے ۳۱، سہ روزہ ۵۔ ہفتہ روزے ۶۷، ۱۵ روزے ۶، ماہنامے ۴، دو ماہی ۱۰۔ الغرض جموں اور کشمیر خطوں کے اخبارات وجرائد ریاست میں شائع ہونے والے اخبارات وجرائد کی مجموعی تعداد ۹۷ فیصد ہے۔ آج کی بات کرے تو صحافت ترقی کی منزلوں کو چھو رہی ہے۔ آج شائع ہونے والے اخبارات میں جرائد ورسائل روز ناموں، ماہناموں کی تعداد بقیہ زبانوں کے مقابلے میں حوصلہ بخش ہے جو اُردو زبان کی ترویج وترقی میں ایک کلیدی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔

kashmirstudent2020.blogspot.com

جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ

جاوید احمد نجار

جہاں تک جموں و کشمیر اُردو افسانے کا تعلق ہے یہاں بھی اُردو افسانہ دیگر ریاستوں کے شانہ بہ شانہ آٹھ دہائیوں سے ترقی کی طرف گامزن ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو نثر کے باقاعدہ نمونے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ملتے ہیں۔ جن میں ہر گوپال خستہ کی نثری کتاب ''گلدستہ کشمیر'' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اُردو زبان کی مقبولیت کو دیکھ کر ڈوگرہ دور کے مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۹ء کو باضابطہ طور پر سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ یوں تو محمد الدین فوق نے سب سے پہلے اُردو افسانے کی طرف توجہ کی اور کچھ تاریخی اور نیم تاریخی کہانیاں لکھیں۔ اس کے بعد چراغ حسن حسرت کا'' کیلے کا چھلکا'' اور دوسرے افسانے ۱۹۲۷ء مین لاہور سے شائع ہوئے لیکن جموں و کشمیر میں اُردو افسانوں کی باضابطہ ابتدا پریم ناتھ افسانوں سے ہوتی ہے۔ وہ ابتداء میں ادب برائے ادب کے نقیب تھے لیکن ترقی پسند مصنفین انجمن کے قیام اور ان کے مشترکہ افسانوی مجموعے ''انگارے'' کی وجہ سے انہوں ادب برائے ادب، رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت وغیرہ خیالات کو ترک کر دیا اور ادب کے خارجی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔ اُن کی کہانی ''ٹیکہ ٹی'' اپنی دور کی ایک عظیم کہانی تھی، پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی صحیح عکاسی کی ہے اور کشمیر کو اصل رنگ و روپ میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کی حقیقی سندرتا نظر آتی ہے۔ انہوں نے کشمیر کے تپتے ہوئے جہنم کدوں کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''شام و سحر''، 'دنیا ہماری' اور 'بہتے چراغ'۔ پردیسی کے دوسرے معاصرین میں پریم ناتھ در، تیرتھ کشمیری، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور وغیرہ شامل ہیں۔ اُن افسانہ نگاروں کے افسانے فن اور تجربے کے لحاظ سے بڑی حد تک ای دوسرے کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فن پاروں میں زیادہ تر کشمیر کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ در کے افسانوں کے دو مجموعے ''کاغذ کا واسدیو'' اور ''نیلی آنکھیں'' شائع ہو چکے ہیں۔ تیرتھ کشمیری نے نئے اسالیب اُجاگر کئے ہیں اور موہن یاور نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے نئے نئے گوشے تلاش کئے ہیں اور رومانی اور نفسیاتی پہلو اُجاگر کئے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا اور تقسیم کے ساتھ ہی ہمارے ریاست بھی افراتفری کی شکار ہو گئی جس کی وجہ سے ریاست ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی ٹولی سے محرم سے ہو گئی اور یہاں کے ادبی فضا پر بھی اثر پڑا لیکن رفتہ رفتہ حالات سدھر گئے اور یہاں کے ادبی افق پر کچھ نئے چہرے ابھرے جنہوں نے اُردو افسانے کو نئے جہتوں سے آشنا کرایا اُن میں علی محمد لون، شیخ بہادر بھان، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ، برج پریمی وغیرہ شامل ہیں۔ حامدی کاشمیری کے تین افسانوی مجموعے 'سراب'، 'برف میں آگ'، 'وادی کے پھول' شائع ہو چکے ہیں اُن میں جدیدیت کی بو ملنے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کی گہرائی جنس کا شدید احساس

kashmirstudent2020.blogspot.com

اُ نکے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے عام ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ طنز کا عنصر خوب ملتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد نئے افسانہ نگاروں کا ایک بہت بڑا قافلہ رواں دواں دکھائے دیتا ہے۔ان کے افسانوی دنیا کے مختلف گوشوں کے مظلوموں کی آہ وفغان کا مشترکہ احساس ملتا ہے۔ان میں مالک رام آئند، یش سروج وغیرہ شامل ہیں۔ان کے افسانوں میں سیاسی ،سماجی اور معاشرتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ حقیقت اور رومان کا دل نشین سنگم ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد محمد ریاست میں افسانے کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔اور کئی قلم کار سامنے آئے جن میں محمد زماں آزوردہ،ظہور الدین،ٹھاکر پونچھی،وغیرہ شامل ہیں انہوں نے جہاں علامتی اور تجربے افسانے لکھ کر ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔جدید دور کے افسانہ نگاروں میں آنندلہر، غمگین غلام نبی،نظیر نذر،اشوک پٹواری وغیرہ قابل ذکر اضافہ ہیں۔الغرض ریاست جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں گذشتہ برسوں میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

kashmirstudent2020.blogspot.com

جموں وکشمیر میں اُردو ناول

ڈاکٹر منظور حسین کمار

ریاست جموں کشمیر کا علاقہ صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔اس ریاست سے ایسے ایسے نامور شعراء ادباء پیدا ہوئے جنھوں نے علم دوستی اور دانش ورانہ صلاحتیوں کی وجہ سے پورے برصغیر میں اپنا نام پیدا کیا۔ جہاں تک ریاست جموں وکشمیر میں ناول کی بات ہے اس کی روایت اگر چہ زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن پھر بھی ناول کی صورت میں جو سرمایہ موجود ہے وہ قابل قدر ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کے ابتدائی نقوش بیسوی صدی کے شروع میں سالک رام سالک کی تصنیف ''داستان جگت روپ'' اور محمد الدین فوق کی ''انارکلی'' سے ملتے ہیں۔

صوبہ جموں سے ''اخبار رنبیر'' کی اشاعت کے ساتھ ہی کئی ناول نگار سامنے آئے جن میں موہن لال مروہ اور وشوا ناتھ ورماہ قابل ذکر ہے۔۱۹۴۷ء قبل پریم ناتھ پردیسی کا نام خاص طور اہمیت کا حامل ہے۔ پردیسی نے ''پوتی'' اور راما نندساگر نے ''اور انسان مرگیا'' کے عنوان سے ناول لکھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد اس شعبے میں خاصی پیش رفت ہوئی اور نئی نسل کے فن کاروں نے کئی ناول لکھے جو ناول کے مغربی وضع کردہ اصولوں کو ہر اعتبار سے پورا کرتے ہیں۔کشمیری لال ذاکر کے ناول ''درد کی راکھ،'' جاتی ہوئی رات'' اور ٹھاکر پونچھی کے ناول ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک''،''یادوں کے کھنڈر'' خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد ناول نگاری کی طرف خاص توجہ ہوئی اور کئی نام ابھر کر سامنے آئے اس دور کے اہم ناول نگاروں میں تیج بہادر بھان خاص اہمیت کے حامل ہے۔''سیلاب اور قطرے'' لکھ کر انہوں نے ناول کی تاریخ میں اپنا نام درج کیا۔ بہادر بھان کا یہ ناول ''کشمیر کی درد بھری زندگی'' غریبی اور افلاس اور استحصال کی عکاسی کرتا ہے۔

غلام رسول سنتوش کا ناول ''سمندر پیاسا ہے'' ناول کی تاریخ میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔''سمندر پیاسا ہے'' ناول میں مصنف نے کسی حد تک ''شعور کی رو'' کی تکنیک کو استعمال کیا ہے۔علی محمد لون نے ''شاید ہے تیری آرزو'' لکھ کر دہلی کے مخصوص طبقے کے معاشرے کی بہترین عکاسی کی ہے۔

kashmirstudent2020.blogspot.com

موجودہ دور میں جن ناول نگاروں نے کئی اہم ناول یادگار چھوڑے ہیں اُن میں شبنم قیوم کا ناول ''یہ کس کولہو کون مرا'' فاروق رینزو ''زخموں کی سالگرہ'' جان محمد آزاد کا ''کشمیر جاگ اٹھا'' حامدی کشمیری کا ''بہاروں میں شعلے'' اور شفق سوپوری نے حال ہی میں ''نیلیما'' کے عنوان سے ایک ناول لکھا ہے جو آدھی واسی عورت پر ہونے والے ظلم وجبر اور استحصال کی عکاسی کرتا ہے۔ اور بقول قدوس جاوید ''یہ ناول اپنے موضوع پر لکھا ہوا اُردو ادب کا پہلا ناول ہے۔ اس طرح ناول نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

بہر حال کہا جاسکتا ہے کہ ان ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں اپنے عہد کے کرب کو اپنے ناولوں میں سمیٹا ہے۔ عصر حاضر کا ہمارا ناول نگار اس بات کا شعوری طور پر ادراک رکھتا ہے کہ ناول محض قصہ گوئی کی صنف نہیں ہے بلکہ یہ ناول انسانی زندگی کی خوشیوں اور تلخیوں اور اس کے غموں اور شادمانیوں کی تصویر پیش کرنے کا ایک بے حد موثر وسیلہ ہے۔ ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں نے خاص طور سے نئی نسل کے ناول نگاروں نے صرف عصری سیاست کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ اس کی روح کے درد کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے جو اض کے انسان کی تقدیر ہے۔ اس میں عصری آگہی کی کتنی ہی پرتیں سامنے آجاتی ہیں وہ مقامیت سے بھی ماورا ہو گیا ہے۔ ہمارے ناول نگار محض تقلید سے کام نہیں لیتے انہوں نے اسالیب کے کئی رنگ خلق کئے ہیں۔ شروع شروع کے ناول اُردو کے بڑے نثر نگاروں اور فکشن لکھنے والوں کے رنگ میں ضرور لکھے گئے لیکن آہستہ آہستہ ہمارے ناول نگاروں نے اپنے راستے تراش لئے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر چہ ناول کی صنف میں ہمارے کارنامے قلیل ہیں اور ان کارناموں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے پھر یہ بات بھی ہے کہ یہاں کے ناولوں سے حقیقت میں اُردو ناول نگاری کا میدان وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

kashmirstudent2020.blogspot.com

شبلی کی تنقید نگاری

محمد امین نجار

شبلی شاعری کا مقصد پڑھنے اور سننے والے کو مسرت عطا کرنا اور قاری کو انبساط کی دولت عطا کرنا سمجھتے ہیں۔ادب کو اجاگر کرنے میں شبلی پیش پیش رہے۔شبلی شاعر،ادیب،ناقد اور محقق ہیں۔ان کی شخصیت بھی ان کی تنقید میں نظر آتے ہیں۔عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''شبلی کی تنقید میں بصیرت کا حسن اور حسن کی بصیرت کا امتزاج بڑی خوبی سے ملتا ہے''۔

حالؔی کے بعد شبلی ہمارے دوسرے بڑے نقاد ہیں جن کی تنقیدی نظریات نے اپنے زمانے کے ادبی ذوق کو متاثر کیا۔ان کی تصنیف ''شعرالعجم'' کی چھوتی جلد ہی وہ کتاب ہے جس میں شبلی نے تنقیدی تصورات اور ان کے وضع کردہ اصول واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔چھوتی جلد کے ابتدائی حصہ میں خاص طور پر شاعری کی ماہیت،مقصد،اہمیت وافادیت،شاعری سے سماج کا رشتہ،شعر کے لوازمات،شعر کی اثر پزیری اور اس کے علاوہ شعر اور غیر شعر کے امتیازات جیسے مضامین پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ان کے تصنیف کا مطالعہ کیجئے تو قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے خیالات حالؔی کے خیالات کی ضد ہے۔یعنی ان کے نزدیک شاعری کا اصل کام اخلاق کو درست کرنا اور زندگی سنوارنا ہے۔شبلی کے نزدیک شاعری کا مقصد پڑھنے یا سننے والے کو مسرت عطا کرنا ہے۔ان کی نظر اس حقیقت پر رہتی ہے کہ فن کار نے فن کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا ہے۔اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ شبلی جمالیاتی نقاد ہیں۔ان کے نزدیک شعر وادب میں حسن کاری ہی اصل شے ہے۔اس طرح حالؔی شعر میں معنی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور شبلی لفظ کو،حالؔی سادگی کے قائل ہیں تو شبلی مینا کاری کے تشبیہہ واستعارہ کو شاعری کے لئے وہ بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔

علامہ شبلی کے نزدیک شاعری دو چیزوں کا نام ہے۔یہ ہیں محاکات اور تخیل۔محاکات سے شبلی کی مراد کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح بیان کرنا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے گویا محاکات وہ شئے ہے جسے ہم تصویر کشی یا آج کی زبان میں شعری پیکر کہتے ہیں۔محاکات سے زیادہ تخیل کو ضروری سمجھتے ہیں اور اسے قوت اختراع یعنی نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کو قوت بتاتے ہیں۔شبلی کے نزدیک شاعرانہ مصوری ہمارے لیے مسرت وانبساط فراہم کرتی ہے۔شبلی کہتے ہیں:

''کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے۔وہ شئے اچھی ہو یا بُری،اس سے بحث نہیں،مثلاً چھپکلی ایک بدصورت جانور ہے،اس کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ایک استاد چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال

kashmirstudent2020.blogspot.com

شبلی شاعری کو تخیل اور محاکات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور تخیل کو محاکات سے بھی زیادہ ضروری قرار دیتے ہیں۔تخیل کے بغیر وہ محاکات کو محض نقالی قرار دیتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ خدا نے انسان کو دو قوتیں دی ہیں۔ایک ادراک اور دوسرا احساس اور ان کا کام سوچنا،غور کرنا اور مسائل کو حل کرنا ہے۔احساس کا کام صرف یہ ہے کہ جب اثر انگیز واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے،خوشی میں سرور ہوتا ہے حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔یہی قوت جس کو احساس کہتے ہیں شاعر کا دوسرا نام ہے۔احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

کتابیں:۔

شعرالعجم	شبلی نعمانیؔ
اردو تنقید نگاری	نورالحسن نقویؔ
اُردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلویؔ

kashmirstudent2020.blogspot.com

حالی کی تنقید نگاری

محمد امین نجار

اردو میں با قاعدہ جدید تنقید کا آغاز حالی کی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے ہوتا ہے۔ جو حالی نے ۱۹۸۳ء میں لکھی۔ یہ اُردو کی پہلی باضابطہ تنقیدی کتاب ہے جس سے اُردو میں تنقید نگاری کی بنیاد پڑی۔ آل احمد سرور نے اسے اُردو شاعری کا پہلا منشور (مینی فیسٹو) کہا ہے۔ اس کتاب کا مقصد حالی کے نزدیک معاشرے کی اصلاح تھا۔ اس میں حالی نے شعر و شاعری کی بنیادی خصوصیات سے بحث کی ہے۔ حالی شاعری کو مسرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے لیے مقصدیت اور افادیت کے قائل تھے۔ شاعری کے تعلق سے حالی کی عمومی رائے یہ ہے کہ سوسائٹی کے لیے شاعری ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ شاعری کے لئے تین شرطوں کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ ہیں تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ۔ تخیل نام ہے خیال کی پرواز کا۔ مطلب یہ کہ شاعر ایک چیز کو دیکھتا ہے اور اس کا خیال دس چیزوں کی طرف جاتا ہے۔ مثلاً پھول میں کبھی اسے خدا کا جلوہ نظر آتا ہے، تو کبھی مجازی محبوب کا پھول کی بکھری ہوئی پتیاں اسے عاشق کے چاکِ غریباں کی یاد دلاتی ہے، کبھی پھول کی مختصر زندگی اسے انسانی زندگی کی بے ثباتی یاد دلاتی ہے۔ حالی کہتے ہیں تخیل کی قوت خداداد ہے، شاعر اسے اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ شاعری کے لئے اتنی ضروری ہے کہ اس کے بغیر شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ مشورہ دیتے ہیں کہ شاعر کا تخیل حد سے زیادہ بلند نہ ہونا چاہئے ورنہ قارئین اسے سمجھ نہ پائیں گے۔ شاعر جو کہتا ہے اس کا مواد اسی کائنات حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اس کائنات کو غور سے دیکھیں اور انسانی زندگی کی کتاب یعنی علم نفسیات سے اچھی طرح واقف ہو اور تیسری بات یہ کہ شعر کہنے کے دوران تفحص الفاظ یعنی وہ الفاظ کی تلاش پر خاص وجہ دے۔

سادگی، جوش، اصلیت کو حالی شعر کی خوبی ٹھہراتے ہیں۔ حالی کے نزدیک کلام کو سادگی کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو، مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو محاورہ اور روزمرہ کی بول چال کے قریب ہوں۔ سادگی سے حالی کا مطلب یہ ہے کہ آسان خیال آسان لفظوں کے ذریعہ پیش ہو، تاکہ سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ جوش سے مراد ہے کہ شعر میں بے ساختگی پائی جائے اور یہ ظاہر ہو کہ یہ شعر بے اختیار شاعر کی زبان سے نکلا، نہ کہ کوشش کر کے کہا گیا اور اصلیت سے مراد شاعری میں جتنا ممکن ہو، مبالغے سے گریز کیا جائے یعنی کوئی بات سچائی سے دور نہ ہو۔ یعنی مبالغے میں حد سے نہیں گزرنا چاہیے۔ حالی شعر کے لئے وزن اور قافیے کو وہ ضروری تو نہیں سمجھتے لیکن ان دونوں چیزوں کو شاعری کا زیور بتاتے ہیں۔

''مقدمہ شعر و شاعری'' میں انہوں نے اُردو کی چار اہم اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے بارے میں اظہارِ خیال کیا

kashmirstudent2020.blogspot.com

ہے۔مرثیہ انہیں پسند ہے کہ اخلاق کی تعلیم کا یہ بہترین ذریعہ ہے اور مثنونوں کو بھی پسند کرتے ہیں کیوں کہ اس میں مسلسل مضامین بیان کیے جاسکتے ہیں۔مقدمہ شعروشاعری کے علاوہ حالیؔ کے تنقیدی نظریات حیات سعدیؔ اور یادگار غالبؔ میں بھی موجود ہیں۔شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''الطاف حسین حالیؔ نے شاعرانہ تنقید کا ایک ایسا البم مرتب کیا جس کا جواب
> اُردو تو کیا مغرب کی بہت کم زبانوں میں ملے گا۔''

کتابیں:

مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالیؔ
اردو تنقید نگاری	نورالحسن نقویؔ
اُردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلویؔ

kashmirstudent2020.blogspot.com

یونٹ سوم

ادبی تنقید: تعریف۔ اہمیت۔ وافادیت:

لفظ ''تنقید'' عربی کے لفظ ''نقد'' یا ''انتقاد'' سے لیا گیا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Criticsm اور یونانی میں Krites کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ تنقید کے لُغوی معنی پرکھنے تولنے، جانچنے یا بھلے بُرے کا فرق معلوم کرنے کے ہیں۔ لیکن ادب میں تنقید سے مُراد کسی فن پارے یا ادبی نگارش کی خوبیوں یا خامیوں کا پتہ لگانا اوراس پر کوئی رائے قائم کرنے کو کہتے ہیں۔

تنقید کو ادب کا دماغ کہا گیا ہے۔ ادب کے لیے تنقید اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندہ رہنے کے لیے سانس۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مطابق تنقید فکر کا وہ شعبہ ہے جو دریافت کرتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ اس کے فوائد کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کی تسکین کرتی ہے؟ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے؟ لگ ایسے کیوں پڑھتے ہیں؟ رچڑس کا کہنا ہے کہ تنقید کا کام تجزیہ اور جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔ رچڑس کا ماننا ہے کہ تنقید ادب کے ساتھ وہ سلوک کرتی ہے جو ڈاکٹر جسم کے ساتھ کرتا ہے۔ یعنی اس کی صحت کا خیال رکھتا ہے۔ تنقید کی مثال اُس مالی کی طرح ہے جو چمن سے گھاس پھوس کو باہر نکالتا ہے اور پھولوں اور پودوں کی دیکھ بال کرتا ہے۔ اس کے باوجود کچھ علمائے ادب تنقید کو ادب کے لئے غیر ضروری بلکہ مفر اور مہلک بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسے ادب کی نشو ونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ تنقید نگار غیر ضروری طور پر ادب پارے اور اس کے قاری کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فلابیر (Fallabeer) نے تنقید کو ادب کے جسم کا کوڑھ بتایا ہے۔ ٹینی سن (Teene Son) نے اسے گیسوے ادب کی جوں کہا ہے۔ ایمرسن (Emer Son) کہتا ہے کہ جو شعر کہنے میں ناکام رہتا ہے وہ اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے تنقید نگار بن

kashmirstudent2020.blogspot.com

Scanned by CamScanner

جاتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادب کے لئے تنقید ضروری ہے۔ یہ قاری کو ادب شناشی کی راہ دکھاتی ہے ایک مفکر نے کہا ہے کہ مصور جب تصویر بناتا ہے تو وہ تصویر کا کچھ حصہ بنانے کے بعد ہاتھ روک لیتا ہے۔ اس ادھوری تصویر کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ کچھ سوچتا ہے۔ پھر آگے بڑھتا ہے اور برش (Brush) حرکت میں آجاتا ہے۔ اس منزل سے شاعر اور ادب کو بھی گزرنا پڑتا ہے۔ شاعر اور ادیب بھی جو کچھ لکھتا ہے اس پر بار بار گور کرتا ہے۔ لفظوں میں ردو بدل کرتا ہے۔ یہ سب کچھ تنقیدی محنت کا نتیجہ ہے۔ دوسروں کی تنقیدی رائے بھی فن کار کے لئے راہ نما ہوسکتی ہے۔ غالبؔ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب غالبؔ کی مشکل گوئی پر نکتہ چینی ہوئی تو انھوں نے انداز کلام بدل دیا۔ غرض تنقید نگار فن پارے کو ہر زاویے سے دیکھتا ہے۔ فن پارے کے وجد میں آنے کے اسباب پر غور کرتا ہے۔ اس کے فنی محاسن کا پتہ لگاتا ہے۔ فن پارے میں اگر کوئی چیز تشریح طلب ہے تو اس کی تشریح کرتا ہے۔

ادبی تنقید کے اپنے اصول اور قاعدے ہیں۔ تنقید نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ غیر جانبداری سے کام لے۔ کھلے دل سے فن پارے کو پرکھے تب کوئی رائے دے۔ تنقید نگار کے لئے ضروری ہے کہ اس میں بہت سے ذہنوں کا صلاحیت موجود ہو۔ وہ تاریخ ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ انسانیت کی آگہی بھی رکھتا ہو۔ وہ فن پارے میں پیش ہوئے خیال یا جذبہ کی اہمیت کو اُجاگر کرے۔ وہ دیکھے کہ ادب پارے کی ترسیل ہوئی ہے یا نہیں۔ آج کل فن پارے کو مختلف زاویوں سے پرکھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے تنقید کے بہت سارے دبستان وجود میں آئیں۔ مثال کے طور پر مارکسی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی اور نفسیاتی تنقید وغیرہ۔

kashmirstudent2020.blogspot.com

Scanned by CamScanner

ترقی پسند تحریک ۔ پس منظر و آغاز

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں تحریکات کا اہم بڑا حصہ رہا ہے۔ مختلف النوع سماجی، اصلاحی اور ادبی تحریکات ہر دور میں سرگرم عمل رہی ہیں۔ لیکن اردو کی کامیاب ترین تحریکات دو ہی ہیں اول سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک دوم ترقی پسند تحریک۔ یہ دونوں تحریکات اپنے مقاصد اور دائرہ کار کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں تحریکات نے اپنے عہد میں اردو زبان و ادب میں نشاۃ الثانیہ (Renaissance) ان میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہندوستان میں سیاسی، قومی، تعلیمی بیداری کو عام کرنے میں کئی تحریکات اٹھیں اور ہر ایک تحریک کا اپنا اپنا پس منظر رہا ہے۔ علی گڑھ تحریک کا خمیر 1857ء کی شکست و ریخت سے تیار ہوا تھا تو ترقی پسند تحریک کو برطانوی سامراج کی آمریت، ملک میں بے اطمینانی و بے چینی کے جذبات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی پیمانے پر جبر و ظلم اور غریبوں کے استحصال اور دبے کچلے ہوئے لوگوں کی حالت زار کے رد عمل میں اٹھنے والی تحریکوں نے جنم دیا۔ بقول ڈاکٹر جویریہ فردوسی: ۔

"اس تحریک کو ظہور میں لانے کے سلسلے میں قومی اور بین الاقوامی دونوں ہی سطح پر سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی تغیرات اور بحران سے پیدا شدہ صورت حال نے اہم رول ادا کیا۔"

روس میں زار حکومت کی زیادتیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں وہاں کارل مارکس کے افکار کا گہرا اثر ہوا۔ لینن خاص طور پر ان سے متاثر ہوئے آخر کار محنت کشوں نے متحد ہو کر 1917ء میں زار

kashmirstudent2020.blogspot.com

Scanned by CamScanner

روس کی حکومت کو شکست دے دی اور حکومت کی باگ ڈور خود سنبھالی۔ حکمران جماعت کا نیا نام "روسی کمیونسٹ پارٹی" قرار پایا۔ یہ لہر ہندوستان تک پھیل گئی اور یہاں کے ادیب و دانشور اشتراکیت اور عوامی حکومت کے حامی ہونے لگے۔ بقول خلیل الرحمان اعظمی:۔

"1917ء روس میں زبردست انقلاب آچکا تھا جس کی لہر ہندوستان تک پہنچ چکی تھی اور لوگ اشتراکیت اور عوامی حکومت کا خواب دیکھنے لگے تھے۔"

"اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"

اس تمام صورت حال نے ہندوستان کے ان طالب علموں جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کو بری طرح سے متاثر کیا۔ نوجوان طلبہ کے اس گروہ نے ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس حلقے میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ ان ادیبوں نے انگلستان میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کے نام سے انجمن قائم کی۔ اور اسی طرح 1935ء میں لندن میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ 1935ء میں انجمن کا پہلا منشور جاری کیا گیا۔ سجاد ظہیر اور دیگر رہنماؤں کی کوششوں کی بدولت صوبائی اور علاقائی سطح پر تشکیل شدہ انجمنوں کو ایک ہی دستور کے تحت متحد کر کے پریم چند کی صدارت میں لکھنو میں 15 اپریل 1936ء کو پہلی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ اور اسطرح ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

تحریر کردہ = عارفہ سعید
ڈگری کالج دہانہ اشت ناگ

kashmirstudent2020.blogspot.com

Scanned by CamScanner

★ اردو شعر و ادب میں جدیدیت کا رجحان

جدیدیت کیا ہے؟ اگر یہ سوال کسی سیدھے سادے جواب کا حامل نہیں ہے تو اسلئے نہیں کہ بذاتِ خود جدیدیت کی تعریف ناممکنات میں شامل ہے بلکہ صرف اس لئے کہ خود اس سوال کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی ہانکتا ہے۔ جدیدیت کو بسا اوقات جدّت کے ساتھ ملتبس کر دیا جاتا ہے حالانکہ دونوں کا فرق واضح ہے لیکن جدیدیت باوجود اس کے کہ اس کی جامع اور مانع تعریف کرنا مشکل ہے ایک خاص اندازِ نظر کا نام ہے وہ اندازِ نظر جو روایت کو ہر حال میں ردّ کرنے پر آمادہ رہتا ہے جو ماضی سے زیادہ حال اور حال کے مسائل کی طرف ترجمانی کو اپنا فرض تسلیم کرتا ہے۔ بقول نریش ندیم سے

"جدیدیت اس اندازِ نظر کا نام ہے جو روایت کی تردید کرتا ہے اور حال کے مسائل کی ترجمانی کو ترجیح دیتا ہے"

"جدیدیت ایک ہمہ پہلو محاسبہ"
از نریش ندیم

اردو شعر و ادب میں جدیدیت کا رجحان یا یوں کہیے آغاز باقاعدہ طور پر 1960ء کے آس پاس ہوا۔ بنیادی طور پر یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل میں آیا۔ جدیدیت کے رجحان کے تحت شعر و ادب میں موضوع اور ہیئت دونوں میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ علامت نگاری، تجریدیت اور لسانی تشکیل نے راہ پائی۔ جدیدیت کے علمبرداروں نے وضاحت پسندی، نعرہ بازی، جماعتی ادب سے انحراف کرکے داخلیت، انفرادیت، رمزیت اور فنی قدروں کی بحالی پر زور دیا۔ جماعت سے زیادہ ذات اہم بنی۔ مختصر یہ کہ جدیدیت نے انفرادیت پر زیادہ زور دیا۔ بقول سنبل نگار سے

"انفرادیت پر جدیدیت نے زیادہ زور دیا۔ فرد کی آزادی اسکے نزدیک بے حد اہم تھی یہ ایک طرح کا ردِ عمل تھا۔"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ پچاس سالوں میں جدیدیت کے ہر رنگ و روپ کے اثرات ہمارے شعر و ادب میں ملتے ہیں۔ مختلف اصناف

P.T.O.

kashmirstudent2020.blogspot.com

Scanned by CamScanner

سخن مثلاً غزل، نظم، افسانہ، ناول اور تنقید سب ہی پر جدیدیت کے یکساں اثرات مرتب ہوئے۔ آزادی کے بعد ترقی پسندی کے بجائے جدیدیت کے رجحانات کو زیادہ تقویت ملی اور اس دور میں متعدد افسانہ نگار سامنے آئے جیسے جیلانی بانو، قاضی عبدالستار، واجدہ تبسم، جوگندر پال، اقبال متین اور رام لال کا نام قابل ذکر ہیں۔

شاعری کے میدان میں خاص طور پر جدیدیت نے ترقی کی اور شاعری بھی حسن لگا کر آگے بڑھتی گئی۔ خلیل الرحمان اعظمی، اختر الایمان، عمیق حنفی اور آخر میں شہریار وغیرہ نے اس صف کو بڑی ترقی دی۔ کمار پاشی، بلراج کومل اور وزیر آغا نے اس روایت کو زندہ رکھا۔ کل ملا غزل نئے امکانات سے روشناس ہوئی۔

اردو تنقید میں ایک نئے نظریے کا آغاز ہوا۔ نئی تنقید نے جدیدیت کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ جدیدیت کی تحریک کے زیر اثر ناقابلِ فہم اور تشریح طلب تخلیقات کو عام قاری کے لئے تنقید کے ذریعے آسان بنا دیا گیا۔ پروفیسر آل احمد سرور، نارنگ، شمیم حنفی، وہاب اشرفی وارث علوی جیسے معتبر نقادوں نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔

اگرچہ جدیدیت نے انفرادیت، قنوطیت جیسے مسائل کھڑے کئے مگر اردو شعر و ادب کو اس رجحان سے زبردست فروغ ہوا۔ بقول فخر الاسلام اعظمی :-

"جدیدیت سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

تحریر کردہ :- عارفہ سعید

kashmirstudent2020.blogspot.com

Scanned by CamScanner